© rasailojaraid.com

اداریہ

لبرل ازم کی تفہیم

(Understanding Liberalism)

ادھر کئی سالوں سے پاکستانی سوسائٹی کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے جن کا تعلق مذہب، سیاست، معیشت اور انتظامیہ سے ہے۔ ان مسائل میں اس قدر الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے کہ ایک عام شہری تو کیا ایک اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی بھی ان مسائل کی نوعیت اور ان کے حل کے لیے کوئی صاف اور واضح ذہن نہیں رکھتا۔ اور وہ اسی پیچ و تاب میں اپنی زندگی کی راتیں بسر کر رہا ہے کہ ان مسائل کو کیوں کر حل کیا جائے؟ جنھوں نے ہمارے ارادوں، ولولوں اور حوصلوں کو مفلوج کر دیا ہے اور پتہ نہیں چلتا کہ 'آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟'

افلاطون نے سچ کہا تھا کہ معاشرے میں پائی جانے والی بدنظمی اور افراتفری دراصل ہمارے اپنے دماغ کی فکری ژولیدگی اور پریشان خیالی کا اظہار ہے۔ غرضیکہ سوسائٹی کا ایک بڑا حصہ یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے اجتماعی مسائل کا الجھاؤ، رشوت، بددیانتی، اخلاقی غیرذمہ داری، ہماری روایتی سستی اور جہالت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اگر ہم بہ قول مرحوم ڈاکٹر محبوب الحق اپنے وسائل کا صحیح استعمال کریں اور اپنی بددیانتی پر قابو پالیں تو دس سال میں اپنی اقتصادی مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم اپنے وسائل کا صحیح استعمال کیوں کر کریں؟ اور بددیانتی پر قابو کیسے پائیں؟ لفظ "اگر" سے تاریخ نہیں بدلتی۔ یہی بددیانتی اور اپنے مسائل سے عدم آگہی ہے، جس کی وجہ سے ایک پرامن و پرمسرت سوسائٹی سے متعلق پاکستانی قوم کا خواب پریشاں ہو کر رہ گیا ہے۔

اس ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ ایک طرف ہم نے ایک صحت مند سوسائٹی کی تعمیر و ارتقاء سے متعلق بانی پاکستان کے صاف، واضح اور قابل عمل افکار سے تغافل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برتا ہے۔ دوسری طرف ہم اپنی اور اپنے گردوپیش کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ نہ تو ہم وقت اور تاریخ سے لڑ سکتے ہیں اور نہ ہی وہ ہماری خاطر اپنی رفتار کو بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ وقت اور تاریخ کے تقاضوں سے تغافل برتنے کا یہ فطری نتیجہ ہے کہ آج ہم جمود' تشدد' انتہاپسندی (خواہ اس کی کوئی بھی نوعیت ہو)' اخلاقی فساد کا شکار ہیں' مذہب کی بلند قدریں: سچائی سے مضبوط پیمان وفا' رواداری' عقل و دانش کی بالادستی' اظہار رائے کی آزادی' صحت مند جمہوری' اخلاقی روایات' غرضیکہ وہ سب باتیں جن کا تعلق ایک صحت مند' پرامن اور خوش حال سوسائٹی سے ہے' آج ہماری سوسائٹی پر سب سے بڑی تہمت بن کر رہ گئی ہیں۔ ان کی جگہ ہمارے دوستوں نے آتشیں تقریروں' ہنگامہ آرائی اور نعرے بازی کو دستور حیات بنا لیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہنگامہ بازی بھی۔ ہماری اجتماعی زندگی کا ایک حصہ ہے' جو ایک وقت تک اپنا سحر یا جادو باقی رکھ سکتی ہے۔ لیکن ہمارے مسائل کا حل اس کے پاس نہیں ہے اور پچاس سالہ تجربے نے بھی یہ بتا دیا ہے کہ اپنے فکری' سیاسی اور اخلاقی فساد (Corruption) کی وجہ سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہم اپنا وقار کھو بیٹھے ہیں۔ چنانچہ ملک کے ارباب دانش نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ہمارے مرض کے لیے دوائیں بھی تجویز کی ہیں' لیکن افسوس! کہ مرض بڑھتا ہی گیا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ برطانوی ہند میں ایک آدمی کو خدا کے گھر میں جا کر دو سجدے کر کے تسکین تو ہو جاتی تھی۔ لیکن آج تشدد کی پالیسی نے غریب سے وہ تسکین بھی چھین لی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آج ملک میں انسانی وقار اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے جو سماجی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ ان کی سرگرمیوں پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن اس مسئلے کا صحیح اور دیرپا حل یہ ہے کہ فکری اور علمی سطح پر نوجوانوں کو ہمارے مسائل کا صحیح حل بتایا جائے اور سنجیدگی سے انہیں یہ شعور دلایا جائے کہ وہ صحیح اور بامقصد تعلیم ہی سے اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ تشدد' جمود' تنگ نظری اور نفرت کی راہ پر چل کر وہ خودکشی تو کر سکتے ہیں' لیکن اپنے اجتماعی اور اقتصادی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسائل حل نہیں کر سکتے۔ جرمنی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں جرمنی نے نہ صرف بری طرح شکست کھائی اور پورا ملک راکھ کا ڈھیر بن گیا' بلکہ اسے دو حصوں میں تقسیم بھی کر دیا گیا۔ لیکن اس نصف صدی میں اس نے اس حد تک ترقی کی ہے کہ آج وہی قومیں اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہیں' جن کے ہاتھوں جرمنی نے شکست کھائی تھی اور خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اس کے دونوں حصے متحد ہو گئے ہیں۔ "عظیم قوموں کی داستان عروج و زوال" نامی کتاب جرمنی کے گرد گھوم رہی ہے۔ مصنف پول کینڈی نے بتایا ہے کہ موجودہ جرمنی کی عظمت کا سہرا ان ہزاروں اساتذہ کے سر ہے' جنہوں نے پوری قوم کو علم سے لیس کر دیا ہے' انہوں نے جرمن بچوں کو "آزادانہ طور پر کیوں کر سوچیں" کی اساس پر تعلیم دی ہے اور وہ ایک نئی سوسائٹی کی تخلیق میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حالانکہ وہ برسوں تک ہٹلر کے استبداد کا شکار رہے اور جمہوری روایات کے نام سے نا آشنا۔ لیکن آج انہوں نے اپنے ملک سے دوسری جنگ اور ہٹلر کے استبدادی دور کے ہر نشان کو مٹا دیا ہے اور ترقی پذیر قوموں کے لیے مثال بن گئے ہیں۔ غرضیکہ علمی اور عملی سطح پر برابر کام کیے بغیر ہم تعمیر و ترقی کے میدان میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ مقام مسرت ہے کہ ہماری سوسائٹی کی اصلاح کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں' ان میں سے ایک نئی کوشش یہ ہے کہ کراچی میں Understanding Liberalism کے نام سے ۲۲' ۲۳ مئی کو ایک سیمینار کا انعقاد ہوا جس کا اہتمام شوکت ثریا کالج برائے لبرل آرٹس اور سوشل سائنسز نے کراچی میں فریڈرچ نعمان فاؤنڈیشن (The Friedrich Naumann Foundation) کے تعاون سے کیا تھا۔ یہ کالج آج کل ملک کے ممتاز دانش ور ڈاکٹر منظور احمد کی سربراہی میں کام کر رہا ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد کراچی یونیورسٹی' شعبہ فلسفہ میں تعلیم و تدریس کا ایک لمبا تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ پاکستان کے ان چند اہل علم میں سے ہیں' جن کو خدا نے علم' عقل اور عشق سے نوازا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک من علم کے لیے دس من عقل چاہیے' اگر عقل نہ ہو تو کتابی علم وبال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جان بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر عقل ہو اور سینے میں دل آگاہ نہ ہو تو منزل کی طرف قدم نہیں اٹھتے۔ چنانچہ ڈاکٹر منظور احمد جہاں "جوہر ادراک" رکھتے ہیں اور مسائل کا معروضی تجزیہ کرنے میں مہارت' وہاں وہ ہمارے سماجی مسائل کا صحیح حل بھی پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مذہب' جمہوریت' قانون' فلاحی ریاست کے نام سے مذہبی اور سیاسی جماعتیں ایک مدت سے ہمارے درد کی جو دوا تجویز کرتی چلی آ رہی تھیں' ان سے ہٹ کر ڈاکٹر منظور احمد نے لبرل ازم کی نئی راہ جس سے عوام آشنا نہیں ہیں' کیوں اختیار کی؟ ہر چند ہم نے ان سے اس "جدت" کی وجہ نہیں پوچھی لیکن ہمارا گمان یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی پختہ فکر نے یہ صحیح اندازا لگایا ہے کہ ہمارے ملک کا پڑھا لکھا طبقہ' جو موجودہ مبہم' غیر واضح اور ناقابل عمل نعروں سے نالاں ہے' ایک بڑے کرب سے گزر رہا ہے۔ مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی ہنگامہ آرائی اور نعرہ بازی سے وہ تنگ آ چکا ہے۔ بے شبہ اسے روحانی' جمہوری اور اخلاقی قدروں سے محبت ہے۔ لیکن ان کے نام لیواؤں نے جس انداز سے ان بلند قدروں کا "عملی مظاہرہ" کیا ہے' اس کی وجہ سے وہ بے اختیار پکار اٹھا ہے: 'اک موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا' اور یہ سمجھتا ہے کہ ان مقدس الفاظ کی روحیں تک تڑپ اٹھی ہیں اور زبان حال سے پکار رہی ہیں:

"ہمیں ہمارے دوستوں سے بچاؤ۔"

موجودہ صورت حال کا صحیح جائزہ لینے کے بعد اس سے بہتر کوئی صورت نہیں تھی کہ اہل علم کو لبرل ازم کے نام سے اکٹھا کیا جائے۔ جو سترھویں صدی میں مغرب میں کلیسا کی بے روح مذہبیت کے خلاف نشاۃ ثانیہ اور اصلاح کی تحریک کے جلو میں سوسائٹی میں آگے بڑھی تھی۔ یہ ایک فکری تحریک تھی' جس کی جڑیں قرون وسطیٰ کے آخری دور میں پیوست تھیں۔ کلاسیکی ادب اور تہذیب میں دلچسپی کی وجہ سے انسان قدیم طرز فکر اور طرز حیات کی تلاش میں تھا۔ کیوں کہ آفاقی کلیسا کی بنیادوں اور جاگیردارانہ معیشت میں تنزل آ رہا تھا اور قومی ریاست (Nation State) کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نشاۃ ثانیہ ہی تھی' جس نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دور جدید میں ایک آزاد انسان (Masterless man) کو جنم دیا۔[1] لبرل ازم نے انسان کی آزاد شخصیت اور سیاسی اقتدار کے باہمی تعلقات پر بحث کی' انسانی شخصیت کی خود مختاری کو تسلیم کرتے ہوئے قانون اور عقل کی بالادستی کو مانا۔ رواداری' اظہار رائے کی آزادی کا اعتراف کیا۔ غرضیکہ انسانی شخصیت کے وقار اور آزادی کے تحفظ کے لیے کلاسیکی ادب اور تہذیب میں ڈوب کر اس نے ''نئی قدروں'' کا سراغ لگایا جنھوں نے سترھویں صدی میں کلیسائی نظام کی جگہ لے لی۔

چنانچہ ہمیں ڈاکٹر منظور احمد کی ذہانت کی داد دینی چاہیے کہ انہوں نے اس نازک وقت میں نازک مسائل پر بات چیت کے لیے لبرل ازم کے نام سے سیمینار کا اہتمام کیا اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم کو دعوت دی کہ وہ بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کو نکالنے کے لیے آگے بڑھیں اور اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں اپنے مسائل کا قابل عمل حل پیش کریں۔

لبرل افکار کی تفہیم سے متعلق سیمینار کا انعقاد ۲۲ اور ۲۳ر مئی کو کراچی کے معروف P.C. ہوٹل میں ہوا۔ پہلا اجلاس ۲۲ر مئی کو صبح دس بجے' ڈاکٹر ذکی حسن کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر ذکی حسن جو علمی اداروں کی تشکیل کا تجربہ رکھتے ہیں' موجودہ وقت میں جناح میڈیکل کالج کے ڈین ہیں۔ لبرل ازم سے متعلق ورکشاپ کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر خالدہ غوث نے بتایا کہ اس موضوع کا انتخاب کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ آج کل ہماری بات چیت' سوچ میں نہ صرف لبرل سیاسی اور اقتصادی افکار بلکہ لبرل روایات اور قدروں کا بھی ذکر آتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں لبرل افکار کو مغرب سے درآمد کیا گیا ہے۔

---

(1) Hallowell, Joh.H.: The Moral Foundation of Democracy (Chicago, 1973) Pp: 68-88.
Reinhold Niebuhr: His Religious, Social and Political Thoughts, Ed. Charles W. Kegley (New York, 1984), Pp. 270-289.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشرق کے روایت پسندوں کا ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ لبرل افکار کا سرچشمہ قرآن مجید کی تعلیمات ہیں جن میں تعلیم کے عمومی فروغ، محنت کی عظمت، بنی نوع انسان کی مساوات اور رواداری کا درس دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور مذہبی کتابوں کی عزت و حرمت نے یہ بتایا ہے کہ دنیا کے تمام انسان گورے ہوں یا کالے، برابر ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ لبرل قدروں اور روایات کو پاکستان میں جگہ کیوں نہ مل سکی؟ چنانچہ اس ورکس شاپ کا مقصد یہ ہے کہ

۱۔ ان وسائل کا پتہ لگایا جائے جو لبرل روایات کے پھیلانے میں مدد دے سکیں۔

۲۔ ان طاقتوں کی بھی نشان دہی کی جائے جو ایک سول سوسائٹی، اور لبرل فکر کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

۳۔ پاکستانی سوسائٹی میں انتہاپسندی کے رجحانات کے ظہور پر بھی بات چیت ہونی چاہیے۔

۴۔ تصوف اور لبرل افکار کے باہمی رابطے کی بھی نشان دہی کی جانی چاہیے۔

ڈاکٹر خالدہ نے اپنی مختصر لیکن خوبصورت تقریر میں اس بات سے بھی آگاہ کیا کہ ایک سوچے سمجھے اور مربوط لبرل پروگرام سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن ترقی پذیر ملکوں میں جہاں ادارے مضبوط نہیں ہیں، وہاں وقتی اور ہنگامی فیصلوں کے پاس شاید ان معاشروں کی خرابیوں کا علاج نہ ہو۔ انہوں نے اس پیش گوئی کی تائید کی جس میں صحیح جمہوریت کی آمد کی توقع چین میں کی جا رہی ہے جہاں مڈل کلاس اپنے جنم کے لیے بہتر مواقع رکھتی ہے۔

ڈاکٹر خالدہ غوث کے بعد ڈاکٹر منظور احمد نے اپنے مقالے میں بڑے سلیقے سے لبرل افکار کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ لبرل ازم یہ کہتا ہے:

۱۔ فرد کو اظہار رائے کی آزادی ہے۔

۲۔ فرد اس بات پر قادر ہے کہ وہ فرد اور سوسائٹی کی ترقی کے لیے ایک نظام اقدار وضع کر سکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ آزادی پر اعتماد اور اظہار رائے کی آزادی کے تحفظ کے لیے وہ اداروں اور پالیسیوں کی تشکیل کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد نے مزید کہا کہ اسلام اپنی ابتداء ہی سے دوسرے مذاہب کی طرح ان قدروں کی حمایت کرتا ہے، جنہیں آج کل لبرل کہا جاتا ہے۔ مثلاً اظہار رائے کی آزادی، انفرادی ذمہ داری اور فرد کی ذاتی اہلیت پر اعتماد کہ وہ اپنے مستقبل کی تخلیق پر قادر ہے۔ قانون کی حکمرانی، غرضیکہ ان سب باتوں کا ذکر ہمیں قرآن اور پیغمبر اسلام کی ذات گرامی میں ملتا ہے۔

انہوں نے آخر میں صاف طور پر کہا جب ہمارا مقصد زیادہ سے زیادہ معاشرے کی بھلائی ہے تو اس کے لیے کسی لبرل تصور میں ترمیم بھی کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد کا پورا مقالہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا بنیادی مقصد کسی ازم کی تبلیغ نہیں بلکہ جبر و تسلط کی قید سے انسانی ذات کی رہائی ہے۔ آج سے کئی سال قبل لندن ٹائمز نے لکھا تھا کہ: انسان کی آزادی، زندگی اور سلامتی پر بات چیت کرنا کہ یہ اس کا (مرد یا عورت) حق ہے۔ دراصل ایک نرالے قانونی ڈھانچے پر بات کرنا ہے۔ ہم درحقیقت جو چاہتے ہیں، وہ انسانی حقوق کا تحفظ نہیں، بلکہ انسانی شخصیت کا تحفظ ہے۔(1)

ڈاکٹر منظور احمد کے بعد پاکستان میں ڈاکٹر آرنو کیلر (A.Keller) نے جو پاکستان میں ایک "جرمن لبرل فاؤنڈیشن" کے ڈائریکٹر ہیں، اپنے خطاب میں کہا: ہماری "لبرل فاؤنڈیشن" کی بنیاد 1958ء میں جمہوریہ جرمنی کے پہلے صدر T.Heuss اور ان کے لبرل دوستوں نے

(1) 'What we really want to protect is not the person's rights but the person himself.' The Times, April 6, 1977.

عربی ادب کے ایک شاعر یعقوب مخزومی نے یہی بات کہی ہے: "کیا تم محبت کے علاوہ کسی دوسری راہ کو جانتی ہو جس پر چل کر تم تک پہنچ سکوں، اس لیے کہ محبت نے مجھے تم سے دور کر دیا ہے۔ (میری منزل محبت نہیں، تم ہو۔)

هل تعلمين وراء الحب منزلة
تدني اليک فان الحب اقصانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھی تھی، جو نوجوان جرمن ڈیموکریسی کی لبرل جمہوری سوچ اور طرزِ عمل کے ارتقاء کے لیے کام کر رہے تھے، کیوں کہ ہم جمہوری روایات سے نا آشنا تھے۔ ہمارا تجربہ تو ایک خوفناک ڈکٹیٹرشپ کا تھا۔ چنانچہ ہماری فاؤنڈیشن لبرل سیاست کے لیے کام کرتی ہے۔ ہمیں لبرل روایات اور قدروں سے دلچسپی ہے کہ انہیں دنیا کے مختلف معاشروں اور ثقافتوں میں کیوں کر قابل عمل بنایا جا سکتا ہے۔ فاضل مقرر نے بتایا کہ پاکستان میں یہ لفظ عام طور پر غلط سمجھا جا رہا ہے۔ انہوں نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کیا کہ انہوں نے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کر کے انہیں بتایا کہ ہم دنیا میں لبرل قدروں کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ ایک من چلے نے کہا کہ ہاں! اب میں سمجھا لبرل ازم کیا ہے؟ مثلاً عورت کی آزادی، اس کا سگریٹ پینا، اپنی کار کو خود چلانا اور خاص قسم کا لباس پہننا۔ اس پر انہوں نے بتایا: افسوس! لبرل افکار کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔

میرے نزدیک لبرل افکار کا مطلب ہے: فردکی آزادی، اجتماعی ذمہ داری، آزادی ذمہ داری کے بغیر آزادی نہیں، بے حیائی ہے۔

اجلاس دوئم میں "اسلامی فکر میں لبرل روایت" پر بات چیت ہوئی۔ صدر اجلاس ڈاکٹر ذکی حسن نے خاکسار کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی، خاکسار نے کہا کہ میں ہجوم کار میں مقالہ لکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ لیکن ڈاکٹر منظور احمد کا جن سے میری پرانی آشنائی ہے۔ حکم تھا کہ تم مقالہ لکھنے کی بجائے "تقریر دل پذیر" سنانے چلے آو۔ چنانچہ خاکسار اس موضوع پر چند بنیادی باتوں کا ذکر کرے گا۔

ا۔ آزادی فکر:

قرآن مجید نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کو بیان کرتے ہوئے سورہ البقرہ: ۱۵۱ اور سورہ الاعراف: ۱۵۷ میں فرمایا: "آپ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روکتے ہیں... اور انہیں اس بوجھ سے (اصرھم) اور بیڑیوں (اغلال) سے آزاد کرتے ہیں جن کے تلے وہ دبے ہوئے تھے۔" اس بوجھ (اصر) اور طوق (اغلال) سے رہائی کا مطلب یہ ہے کہ رسول کریمؐ نے ان مذہبی رسم و رواج اور توہم پرستیوں کو ختم کر دیا، جنھوں نے انسان کے فکرو عمل کو اپنا قیدی بنا رکھا تھا۔

قرآن نے مزید فرمایا: کہ پیغمبر اسلامؐ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اور ان کا تزکیہ نفس کرتے ہیں۔ تزکیہ نفس سے مراد ہے انسان کے قلب و نظر کو جلاء بخشنا۔ اور معنوی بیماریوں سے اسے نجات دلانا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کا بغض و حسد، نخوت و پندار اور دجل و فریب جیسی بیماریوں پر قابو پانا زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ افلاطون نے سچ کہا تھا کہ انسان کی سب سے بڑی جنگ خود اسے اپنے آپ سے لڑنا پڑتی ہے۔

چنانچہ پیغمبر اسلام کی الہامی تعلیمات سے لوگوں نے روحانی طور پر ایک نیا جنم (Spiritual Re-birth) لیا اور ان کی داخلی زندگی میں ایک نئی صبح طلوع ہوئی۔ جس نے آگے چل کر پورے جزیرۂ عرب میں ایک اخلاقی انقلاب بپا کیا۔ اس اخلاقی انقلاب کے بنیادی خدوخال یہ ہیں:

ا۔ انسان اس کائنات میں ایک ممتاز مخلوق ہے، جسے فکر و عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ اسی آزادی کی وجہ سے وہ اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری میں ناکام رہتا ہے تو وہ اپنی ناکامی کا بوجھ خدا یا سوسائٹی کے کندھوں پر ڈال نہیں سکتا۔ اس آزادی فکر میں مذہبی آزادی بھی شامل ہے۔ قرآن مجید نے صاف طور پر اعلان کیا: لا اکراہ فی الدین (البقرہ: ۲۵۶) مذہب کے بارے میں کسی قسم کا کوئی جبر نہیں۔ ہر آدمی جو عقیدہ رکھنا چاہے، رکھ سکتا ہے۔ جب رسول کریمؐ اور آپ کے ساتھیؓ مکہ میں اپنی حق پرستی اور حق گوئی کی بنیاد پر لتلا اور آزمائش کی منزل سے گزر رہے تھے، اس وقت آپ نے فرمایا: "لکم دینکم و لی دین" (الکافرون) میرے پاس میرا دین ہے اور تمہارے پاس تمہارا۔ لیکن اہل مکہ آپؐ کی بات کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم اپنے آبائی اور قومی دین سے باہر نہیں جا سکتے۔ اس لیے اس نئے دین کو نہیں مانتے اور نہ ہی رسول کریم اس کی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ اہل مکہ نے رسول کریمؐ کے خلاف جو معاندانہ رویہ اپنایا جو آگے چل کر تصادم کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی فکری آزادی تھی جس کا وہ انکار کر رہے تھے۔ حالانکہ پیغمبر اسلام نے بار بار ان سے کہا کہ وہ کسی پر اپنی دعوت بزور مسلط نہیں کرتے۔ کیوں کہ قرآن نے کہا ہے کہ آپ ان پر کوئی داروغہ نہیں ہیں (وکیل، مصیطر)۔ آپ کا کام صرف خوش اسلوبی سے اپنی دعوت کو ان تک پہنچا دینا ہے۔ اسے قبول کرنا یا نہ کرنا ان کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم مفکرین نے مثلاً امام ابو حنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم ریاست کے درمیان باہمی جنگ کی وجہ کفر (اسلام کا انکار) نہیں، بلکہ جارحیت ہے۔ چنانچہ کسی آدمی کو جبراً مسلمان بنانا گناہ ہے۔ اور جب بھی کسی مسلم بادشاہ نے غیر مسلم شہریوں کے مذہبی امور میں مداخلت کی۔ تو علمائے حق نے اس کی سخت مذمت کی، اس فکری آزادی کا نتیجہ تھا کہ اسلام نے مذہبی رواداری کا درس دیا اور اختلاف مذہب کے نام پر ہر قسم کے تعصب، عناد اور تنگ نظری کی مذمت کی۔ چنانچہ قرآن نے خدا سرشاری اور انسان دوستی کے لیے اتقاء کا لفظ بولا۔ (البقرہ: ۱۷۷)

غرضیکہ فکری آزادی اور رواداری کو اسلام میں زندگی کی ایک بنیادی قدر تصور کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا: الاصل فی الناس الحریہ۔ انسان بنیادی طور پر آزاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون نے کہا ہے کہ اگر ایک غیر مسلم غلام اپنے ملک سے نکل کر اسلامی ریاست میں داخل ہو جائے تو وہ خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔

تاریخ نے ہمیں بتایا ہے کہ رومن امپائر میں حضرت مسیحؑ کے ماننے والے تین سو تیرہ سال تک برابر اپنے دین کی وجہ سے ظلم و ستم کا شکار رہے۔ بالآخر ۳۱۳ء میں یہ اعلان کیا گیا: "ہم انہیں (مسیحی حضرات کو) اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنے ذاتی افکار کو آزادی سے رکھ سکتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ اور بغیر کسی ڈر کے عبادت کے لیے اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ گورنمنٹ اور اس کے قوانین کا احترام کریں گے۔"[1] مغرب میں مذہبی آزادی کا یہ پہلا منشور ہے۔ جو رومن امپائر نے جاری کیا' لیکن اس سے پہلے مشرق میں مہاراجہ اشوک نے بہت خون خرابے کے بعد برصغیر میں مذہبی آزادی کے بارے میں یہ تاریخی اعلان کیا: "خدا کا محبوب بادشاہ مذہب کی ہر شکل کی عزت کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آدمی کے لیے سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ وہ اپنے دین کا احترام کرے' لیکن دوسرے مذہب کو قطعاً برا بھلا نہ کہے۔ اور جو کوئی اس کے برعکس کرتا ہے' وہ (اپنے اس رویہ سے) اپنے ہی دین کو مجروح کرتا ہے۔"[2]

مشرق اور مغرب میں آزادی فکر یا اظہار رائے کی آزادی سے متعلق یہ دونوں اعلان ایک مدت گزرنے کے بعد اپنی تاثیر کھو بیٹھے تھے۔ اور مذہبی آزادی ایک گم شدہ حقیقت بن چکی تھی۔ مذہب اور جمود' مذہب اور تنگ نظری' مذہب اور عقل دشمنی ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ یہاں تک ساتویں صدی میں اسلام نے آکر اس بھولی ہوئی سچائی کا اعلان کیا کہ ہر انسان کو آزادی فکر اور اظہار رائے کی آزادی کا حق ہے۔ بلکہ یہ بھی اعلان کیا جو لوگ کائنات میں غور وفکر نہیں کرتے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو نہیں پڑھتے۔ تاریخ' تجربے اور مشاہدے کا انکار کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اپنی عقل دشمنی کی وجہ سے سچائی کا انکار کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے دل' آنکھ اور کان بے کار ہو جاتے ہیں اور ان پر فطرت مہر لگا دیتی ہے کہ وہ روشنی کی طرف نہ آئیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے معروف انقلابی دانشور ایم۔این' رائے (Roy) کو اپنی کتاب: "اسلام کا تاریخی کردار" میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ "عظیم مذاہب میں آخری عظیم تر مذہب اسلام ہے۔ جس نے تمام مذاہب کی بنیاد کو ڈھایا ہے۔"[3]

---

(1) Bury, J.B.: A History of Freedom of Thought. (Oxford, 1957), P.33.

(2) Radhakrishnan S.: The Hindu View of Life, (London, 1961), P.41.

(3) Roy, M.A: The Historical Role of Islam, Bombay, P. 83.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی اسلام نے ساتویں صدی میں رائج مذہبی تصورات پر ضرب کاری لگائی۔

عقل کی بالادستی:

آزادی فکر کا ایک مظہر انسانی سرگرمیوں میں عقل و دانش کی بالادستی ہے۔ قرآن میں بار باران لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو عقل و خرد کی بجائے' بے ہودہ رسم و رواج' خرافات اور توہمات کی پیروی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے کہا گیا: "ان کے پاس عقل ہے لیکن اس سے کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں۔ کان ہیں' لیکن سنتے نہیں (الاعراف: ۱۷۹)۔ یہ لوگ حیوانات سے بھی بدتر ہیں۔" چنانچہ یہ کہنا تاریخی طور پر صحیح ہے کہ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ساتویں صدی میں کسی بیرونی دباؤ کے بغیر یہ تاریخی اعلان کیا کہ انسان کو ایک رائے رکھنے اور اس کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ نیز یہ کہ عقل "زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔"[1] اور اسی عقل و شعور کی وجہ سے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ مسلم مفکرین نے عقل اور وحی کے اجتماع کو "نور علی نور" سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ زندگی کو دونوں سے (وحی اور عقل) رہنمائی ملتی ہے' دونوں کا باہمی رشتہ وہی ہے جو آنکھ اور سورج کی روشنی کا ہے۔ آنکھ سورج کی روشنی کے بغیر اور روشنی آنکھ کے بغیر' انسان کے لیے بے سود ہیں۔

توازن اور اعتدال پسندی:

قرآن نے مسلم جماعت کے مزاج کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ جماعت "امتہ وسط" (البقرہ: ۱۴۳) ہے۔ یعنی اس کی سوچ اور طرز عمل میں ایک توازن ہے اور اعتدال۔ یہ جماعت افراط و تفریط سے دور رہتی ہے' ایک دوسری آیت میں اسے "بہترین امت" (خیرامہ)

(۱) اسلام میں عقل کے بنیادی کردار پر حسنی زینتہ کی کتاب "العقل عند المعتزلہ" (بیروت ۱۹۷۸ء) قابل مطالعہ ہے۔ اس میں فاضل مولف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ عہد اول کے اہل علم' خاص طور پر معتزلہ نے عقل کو ادراک و معرفت کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ فاضل مولف نے معتزلہ کے افکار کو لبرل افکار سے موسوم کیا ہے (ص ۱۸)۔ ڈاکٹر احمد امین نے تو مسلمانوں کے فکری زوال کی ایک وجہ مسلم سٹیج سے معتزلہ کو پیچھے دھکیلنا بھی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہا گیا ہے۔ کیوں کہ نیکی کی تلقین اور برائی سے بچنے کی نصیحت اس کی زندگی کا مشن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم جماعت کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کا نصب العین سوسائٹی میں عدل و انصاف کو قائم کرنا ہے۔ یعنی قانون کی حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے ہر شہری کو جان' مال' آبرو اور دین کا تحفظ فراہم کرے اور سوسائٹی میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو۔ جہاں ملک کے تمام شہری امن و آشتی اور پیار و محبت سے رہ سکیں۔ مسلم مفکرین کا کہنا ہے کہ دنیا میں پیغمبروں کی آمد کا بنیادی مقصد عدل و انصاف کا قیام ہے۔ علامہ ابن قیم نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر وہ راہ جو عدل و انصاف کی منزل تک جاتی ہو' اسے دین ہی کا حصہ سمجھا جائے گا۔ اس سلسلے میں بڑے کامیاب تجربے حضرت عمرؓ نے کیے۔ لیکن جب ایک وقت کے بعد حضرت عمر کو اپنی معاشی عادلانہ پالیسی سے اطمینان نہ ہوا تو انہوں نے کہا: "آج مجھے جن باتوں کا پتہ چلا ہے۔ اگر ان کا پتہ پہلے چل جاتا تو میں مال دار لوگوں کی زائد دولت کو چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔" اجتماعی انصاف سے ان کی گہری وابستگی اور اخلاقی ذمہ داری کا گہرا احساس ہی تھا' جس کی وجہ سے انہوں نے یہ بات کہی۔ ایک دوسری جگہ پر انہوں نے کہا کہ اگر (عراق میں) دریائے فرات کے کنارے پر بے پروائی کی وجہ سے ایک اونٹ مرجائے تو روز حشر میں' مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

صحیح بات یہ ہے کہ دنیا میں لوگوں کے سامنے اور آخرت میں خدا کے سامنے جواب دہی کے گہرے احساس نے انسان کی اخلاقی اور سیاسی زندگی میں ایک بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

القصہ انسان کی فکری' اخلاقی اور اقتصادی زندگی کے بارے میں اسلام نے جو کچھ کہا ہے۔ ہم نے اسے نہایت ہی اختصار سے بیان کر دیا ہے۔ اسلام نے انسانی تہذیب و تمدن میں جو صحت مند کردار ادا کیا ہے' آج دنیا کے منصف مزاج دانشوروں اور سکالرز نے بغیر کسی تحفظ کے اس کا اعتراف کر لیا ہے' لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس تاریخی کردار کا کسی گروہ کو یہ احساس نہیں ہے' تو وہ شاید ہم ہی نے عمومی طور پر اپنی ہی روشن روایات سے منہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موڑ لیا ہے اور قرآن مجید، آں حضرت ﷺ اور اپنے قدیم مفکرین کے افکار کو فراموش کر دیا ہے جس کی وجہ سے اگر دنیا میں فکری آزادی، انفرادی ذمہ داری، قانون کی حکمرانی، عقل کی بالادستی کے بارے میں کوئی تحریک چلتی ہے، تو ہم اسے شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ گویا کہ ہم خود اپنے ہی کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں۔ ابوالکلام آزاد نے سچ کہا تھا: ''انہوں (مسلم مفسرین) نے جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اتار لیں کہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔'' (دیباچہ، ترجمان القرآن)۔ چنانچہ وقت آگیا ہے کہ ہم نہایت ہی سنجیدگی سے اپنے انفرادی اور اجتماعی کردار کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہم کس حد تک اخلاص و دیانت سے اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو پورا کر رہے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے، تو پھر ہمیں اپنے قومی زوال کا ماتم بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے اپنی فکری اور اجتماعی مشکلات پر قابو نہ پایا تو وقت ہمارے ساتھ کوئی ایسا اچھا سلوک نہیں کرے گا، اس صدی کے آغاز میں اقبال نے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ: مجھے ہماری راہ میں آنے والی مشکلات کا احساس ہے۔ لیکن میں صرف یہ کہوں گا کہ اگر ہم نے اپنی مشکلات پر قابو نہ پایا تو زمانہ بہت جلد ہم سے اپنی جان چھڑا لے گا۔''(1)

آخر میں کراچی میں لبرل ازم کی تفہیم پر ڈاکٹر منظور احمد اور ان کے ساتھیوں نے جس سیمینار کا اہتمام کیا ہے، اس پر مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ

۱۔ اس سیمینار کی کاروائی کو چھاپا جائے اور اگر اس کا خلاصہ اردو، سندھی اور پشتو زبانوں میں بھی شائع ہو تو زیادہ مناسب ہو گا۔

۲۔ اس موضوع پر لاہور، اسلام آباد، کوئٹہ، پشاور اور مظفر آباد میں بھی ایسے سیمینار کا انعقاد

(1) "All that I can say is that if we cannot get over our difficulties, the world will soon get rid of us."

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سود مند رہے گا اور ہمارے نوجوانوں کو اپنے مسائل پر سنجیدگی سے سوچنے کا موقعہ ملے گا۔

۳۔ ہمیں احساس ہے کہ ہماری دراز نفسی کی وجہ سے یہ اداریہ پورے سیمینار کی کاروائی کا احاطہ نہ کر سکا۔ ۲۳ر مئی کی کاروائی دلچسپ تھی جس میں کھل کر گلے شکوے کئے گئے اور پولیس کے ترجمان نے خوش اسلوبی سے جوابات بھی دیئے۔

افسوس! بات لمبی ہو گئی، لیکن جو بات کہنا چاہتا تھا، وہ ابھی تک نا تمام ہے۔

زبان زنطق فروماند وراز من باقیست
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

رشید احمد (جالندھری)

☆☆☆

© rasailojaraid.com